⊙ ثمینہ سیف
پی ایچ ڈی اسکالر، شعبہ اردو، جی سی یونیورسٹی، لاہور
⊙⊙ ڈاکٹر نسیمہ رحمٰن
ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبہ اُردو، جی سی یونیورسٹی، لاہور

ناول انسان، اے انسان کا فکری و فنی جائزہ

Abstract:

'Insan-Ay-Insan' is believed to be one of the finest and most important novels in the 21st century's Urdu literature. The subject of discussion in literature had always been the man and the life since its beginning and especially in fiction; countless books have been published on this subject so far. But this novel encompasses the theme of all virulent social realities of a man's life in the most eloquent way. It deals with man's life that is full of troubling, trembling, stifling and disturbing thoughts based on how the life goes on. The novelist has beautifully covered both micro and macro aspects of life; from an individual's personal experiences to life's universal experiences. He has brilliantly portrayed the transition of human behaviour from birth to death in this novel. This article highlights the novel's literary characteristics through a detailed discussion on its thematic and technical aspects.

Keywords:

Novel, Hasan Manzar, Sociology, Social unrest, Psychology

انسان، اے انسان حسن منظر کا پانچواں ناول ہے۔ یہ ضخیم ناول ۲۰۱۳ء میں شائع ہوا اور اپنی فنی و ادبی خوبیوں کی بنا پر ادبی حلقوں میں پسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا۔ ناول کے آغاز پر عنوان یوں درج ہے:

انسان، اے انسان!
آخر تو کیا ہے؟

(ایک زندگی)

یہ ناول ایک انسان کی زندگی کی کہانی ہے، وہ زندگی جو لمحہ بہ لمحہ تغیرات کے سمندر میں بہہ رہی ہے۔ یہ ناول انسان کی ذہنی کشمکش کے نتیجے میں پیدا ہونے والی تبدیلیوں سے بحث کرتا ہے۔ اس کرداری ناول میں ایک مخصوص کردار کے حوالے سے برصغیر کے تاریخی و سماجی حالات قلمبند کیے گئے ہیں۔ یہ ناول ایک ایسے انسان کا بیانیہ ہے جو حالات کے ہاتھوں بے بس ہے اور مشیت ایزدی کے ہاتھوں ایک کھلونا ہے۔ اِس ناول کی کہانی میں ہر انسان کو کم و بیش اپنا عکس دکھائی دیتا ہے۔ زندگی کے نشیب و فراز کو اپنے اندر سمیٹے یہ ناول واضح کرتا ہے کہ انسان فانی ہے جب کہ زندگی کے دریا میں سکوت ہرگز نہیں، یہ تو ازل سے تسلسل سے بہہ رہا ہے۔ ناول کا مرکزی کردار تلمیذ الرحمٰن ہے اور اِسی کے گرد ناول کی کہانی گھومتی ہے۔ حسن منظر نے اِس ناول میں حیات تا موت تمام رویوں کو بڑی خوب صورتی سے بیان کیا ہے۔ اِس مرکزی کردار کے ذریعے ناول نگار نے بچپن کے تجربات اور مشاہدات کا باریک بینی سے نفسیاتی مشاہدہ کیا ہے۔ چھ سال کی عمر میں تلمیذ الرحمٰن مخالف جنس کے ساتھ چھپ کر ناز یبا حرکتیں بھی کرتا ہے لیکن دوسری بار اِس کی یہ کوشش کسی اور لڑکی پر ہوتی ہے مگر وہ اِس کی شکایت لگا دیتی ہے جس کے بعد تلمیذ الرحمٰن خوب پٹتا ہے۔ تبھی وہ یہ راز جان لیتا ہے کہ چھپ کر کیا جانے والا گناہ جو آشکار نہ ہو وہ قابلِ معافی ہے۔

اِس جرم کی پاداش میں اِسے نینی پور سے بڑی بہن کلثوم کے پاس راجدھانی بھیجا جاتا ہے جہاں کے حالات اِس کی اصلاح کی بجائے اس کی شخصیت میں بگاڑ پیدا کرتے ہیں۔ یہاں پیٹ بھر کر کھانا بھی اسے میسر نہیں آتا مجبوراً وہ جوئے سے پیسے جیت کر اپنے پیٹ کی بھوک کو ختم کرتا ہے۔ بہنوئی کی سرزنش اور ان کے گھر کا سخت گیر ماحول تلمیذ الرحمٰن کو سخت ناپسند ہے۔ تھوڑے عرصے کے بعد اِس کی والدہ اور والد دونوں کا انتقال ہوتا ہے۔ بہنوئی اور بہن اسے گھر سے نکال دیتے ہیں۔ تلمیذ الرحمٰن کا تایا اس کے باپ کی تمام وراثت کو اسلامی قانون کے مطابق تقسیم کر کے کچھ عرصہ اس کی پڑھائی کا خرچہ دیتے ہیں اور بعد میں پیسے ختم ہو جانے پر اِسے زندگی کی بقا کے لیے خود تگ و دو کرنا پڑتی ہے۔ اس دُنیا میں انسانوں کے ٹھاٹھیں مارتے سمندر میں وہ طوائفوں، فلم کیپٹل سٹی کی دل آرا اور فتی، رشن اور کلو جیسے پست طبقے کے لوگوں سے ملتا ہے۔ اسی دوران فسادات شروع ہو جاتے ہیں اور وہ نئے ملک پاکستان آ جاتا ہے یہاں اس کی ملاقات اسکوارڈن لیڈر جبار سے ہوتی ہے اس کی مالی حالت قدرے سدھرنے لگتی ہے مگر اخلاقی لحاظ سے اس کے کردار کا دیوالیہ نکل چکا ہوتا ہے کیونکہ اسے شراب اور قحبہ خانے کی لت پڑ چکی ہوتی ہے۔ بعد ازاں اس کی ملاقات غیور جرنلسٹ، مرتضیٰ قریشی وکیل اور شان الٰہی کلرک سے ہوتی ہے۔ تلمیذ الرحمٰن نے بچپن میں چھپ کر گناہ کرنے کا بھید جان لیا تھا نیز اس کی تن آسانی اسے جرائم کی طرف لے آئی ہے اور وہ جیل چلا جاتا ہے۔ جہاں فتی اور اپنی رکھیل امینہ کی مدد سے یہ جیل کی سلاخوں سے باہر آتا ہے۔ حالات بدلتے ہیں اس کی شادی میمونہ سے ہوتی ہے اور وہ تین بچوں کا باپ بن جاتا ہے۔ روز بروز بگڑتے معاشی حالات اسے دوبارہ جوئے کی طرف راغب کرتے ہیں۔ اس کا گھر امن کا گہوارہ بننے کی بجائے جوئے کا اڈا بنتا ہے۔ اس کا بڑا بیٹا نجم باپ کے ناروا سلوک سے بگڑ جاتا ہے اور گھر چھوڑ جاتا ہے۔ ایک دن نجم مردہ حالت میں لاوارث پایا جاتا ہے اور میمونہ جو پہلے ہی ظلم کی چکی میں پس رہی تھی مزید دلبرداشتہ ہو کر اسے ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر چلی جاتی ہے۔ تلمیذ الرحمٰن، سردار

اور نگ ناز سے ملتا ہے جو ایک سیاسی وڈیرہ ہے اور یہ تلمیذ الرحمٰن کو ایک قتل کرنے کا حکم دیتا ہے۔ تلمیذ الرحمٰن اس کے حکم کی تعمیل نہ کر کے اس کے عتاب کا نشانہ بنتا ہے۔ تلمیذ الرحمٰن کو جھوٹے مقدمے میں پھنسوا کر اسے سزائے موت کی سزا سنائی جاتی ہے۔ جیل میں آ کر وہ ماضی کے جھروکوں میں جھانکتا ہے اب اس کے پاس احساس ندامت کے سوا کچھ نہیں بچتا۔ جیل میں وہ صوم وصلوٰۃ کا پابند ہو جاتا ہے۔ بظاہر لگتا ہے کہ یہ کردار اب سدھر رہا ہے مگر اسی دوران سیاسی قیدیوں کو چھڑانے کے لیے جیل توڑی جاتی ہے اور بھگدڑ میں تلمیذ الرحمٰن بھی جیل سے فرار ہو جاتا ہے۔

ناول انسان، اے انسان کی کہانی دراصل اِن عوامل، محرکات اور قوتوں سے بحث کرتی جو کہ انسان کی زندگی میں کارفرما ہیں۔ بعض اوقات ان قوتوں کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہوتا۔ یہی قوتیں انسان میں کبھی مثبت اور کبھی منفی تبدیلیوں کا باعث بن کر انسان کے بنانے اور بگاڑنے میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ بسا اوقات یہ ان دیکھی قوتیں مذہب، سیاست، قانون اور اخلاقی وسماجی اقدار کا روپ دھار کر انسان کے باطن میں غصہ اور نافرمانی کی موجب بنتی ہیں۔ ناول نگار صحیح معنوں میں اپنے معاشرے کے نباض ہیں اور وہ ان معاشرتی مسائل کی دکھتی رگوں سے بخوبی آگاہ ہیں۔ حسن منظر ان تلخ حقیقتوں سے نہ تو آنکھ چراتے ہیں اور نہ ہی مبلغ اور واعظ بننے کی کوشش کرتے ہیں، آپ کمال چابکدستی سے انسانی زندگی کو معاشرتی، سیاسی، مذہبی، اخلاقی اور نفسیاتی تناظر میں دیکھتے ہیں۔ ناول میں مذہب جو ہر انسان کا ذاتی فعل ہے سے لے کر سیاست کی عیاریوں اور مکاریوں کو بے نقاب کیا گیا ہے اور یوں یہ کہانی ہر انسان کو کسی نہ کسی موڑ پر اپنی زیست سے قریب تر لگتی ہے۔ درحقیقت مذہب ہی وہ واحد ادارہ ہے جو فردِ واحد کی شخصیت کو بھرپور اور فعال بنا سکتا ہے جب کہ انسانی فطرت بنیادی طور پر گناہ کی طرف جلد راغب ہوتی ہے۔ نافرمانی انسانی ذات کا حصہ ہے اور یہ نافرمانی کبھی تو انسان اپنی ذات سے، کبھی معاشرتی اصولوں سے اور کبھی خدا سے بھی کر بیٹھتا ہے۔ نافرمانی کی سزا کے بدلے آدم وحوا کو جنت سے نکلنا پڑا اور اسلام سے قبل بہت سی اقوام نافرمانی کی وجہ سے نیست و نابود ہو گئی تھیں۔ یہی نافرمانی جو انسانی سرشت اور فطرت کا خاصہ ہے، ناول کا مرکزی کردار تلمیذ الرحمٰن بارہا اس کا مرتکب ہوتا ہے۔

ناول کی کہانی تلمیذ الرحمٰن سے شروع ہو کر تلمیذ الرحمٰن پر ہی ختم ہو جاتی ہے۔ ناول کے اِس مرکزی اور اہم کردار تلمیذ الرحمٰن کے متعلق مہر و نہ لغاری کا یہ تجزیہ حقیقت پر مبنی ہے کہ اس کردار کے توسط سے حسن منظر نے پاکستانی سماج کی نقش گری کی ہے۔ یہ سماج کا پیدا کردہ کردار ہے اِس کی نفسیاتی گھٹن بھی دراصل سماج میں موجود حبس اور گھٹن ہے۔ حسن منظر نے اِس کردار کی ناکامی، نا آسودگی کے اظہار سے سماج کی قلعی کھول دی ہے۔''(۱) اسی کردار پر ناول کے پلاٹ کی بنیاد رکھ کر کہانی کی بنت بنی گئی ہے، مرکزی کہانی تلمیذ الرحمٰن کی ہے جب کہ اس کے ساتھ ضمنی کہانیاں بھی وقفے وقفے سے آتی ہیں۔ ناول کا پلاٹ سادگی اور عمدگی سے تیار کیا گیا ہے جس میں ربط و تسلسل بدرجہ اتم موجود ہے نیز عصری حساسیت کے تقاضوں کو بروئے کار لاتے ہوئے ناول نگار نے اس ناول کے پلاٹ میں ایک پوری انسانی زندگی کا احاطہ کیا ہے۔ اس کرداری اور سوانحی ناول میں یہ دیکھنے کی جسارت کی گئی ہے کہ کس طرح انسانی باطن میں جنم لینے والی کشمکش انسانی لاشعور کی خارجی دُنیا کے نہاں خانوں میں کہیں زیادہ پیچیدگی، ابہام اور نقصان کا موجب بنتی ہے۔ ناول نگار کی فعال شخصیت نے وقت کی تین جہتوں یعنی ماضی، حال اور مستقبل میں وحدت پیدا کی ہے۔ تلمیذ الرحمٰن جیل میں جب ماضی کے جھروکوں میں

جھانکتا ہے تو اسے پشیمانی ہوتی ہے اور یہ کردار حال کے خرابے کی افسردہ ساماں سمیت مستقبل کا انتظار کرتا ہے۔ دلچسپ امر یہ ہے کہ ناول حال، ماضی اور مستقبل کا بیک وقت بہترین امتزاج بھی ہے اور اس ناول میں قیامِ پاکستان سے قبل اور بعد کے ادوار کو پیش کر کے اس کے پلاٹ کو وسعتوں کا حامل بنایا گیا ہے۔ علاوہ ازیں حسن منظر نے اس پلاٹ کی تشکیل کے دوران تقسیمِ ہند کے نفسیاتی محرکات کو سیاسی، مذہبی اور سماجی حوالوں سے دیکھا ہے۔ ناول کے پلاٹ کو متنوع اور کثیر الجہات کا حامل جان کر امتیاز پراچہ لکھتے ہیں:

> "Insaan, aye Insaan! by Hassan is a well paced novel with an intiguing coming-of-age plot ..... Although dates are not mentioned in the novel, the period in which the story is set appears to be, roughly, from the early 1940s to 1960s. The social political and cultural background of the narrative is remarkable detailed, adding substance to the plot and character pre-partition northen India, the freedom struggle, the condition that drove people to leave their ancestral home and settled communties, as well as resettlement in a new country, are depicted minutely."**(2)**

ناول میں نہ صرف انسانی ذاتی کشمکش کو داخلیت اور خارجیت کا امتزاج بنا کر پیش کیا گیا ہے بلکہ اس میں شعور کی رو کی تکنیک بھی ایسے استعمال کی گئی ہے کہ کہانی کا ربط اور تسلسل نہیں بگڑتا۔ تلمیذ الرحمٰن کی جیل کی زندگی کو ناول نگار نے قدرے پھیلا کر پیش کیا ہے، یہاں آ کر کہانی سست پڑ جاتی ہے مگر اچانک ہی ناول نگار ڈرامائی انداز میں اختتام کر کے کہانی کا رُخ بدل کر رکھ دیتا ہے۔ اچانک جیل ٹوٹ جاتی ہے اور تلمیذ الرحمٰن فرار ہو جاتا ہے۔ انجام کار کا یہ طریقہ کار سعادت حسن منٹو کے مماثل ہے۔ منٹو کے افسانوں کی مانند حسن منظر کے ناول کا انجام حسب توقع الٹ ہے اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ منٹو کے افسانوں کی طرح ''انسان، اے انسان'' کی کہانی کا منطقی اختتام نہیں ہوتا بلکہ ناول نگار اس کا فیصلہ قاری پر چھوڑ دیتا ہے۔ دراصل انسان، اے انسان کی کہانی کا اختتام اس لیے بھی نہیں ہے کیونکہ یہ کہانی ایک زندگی کی ہے، جس طرح زندگی اپنی پیچیدگیوں سمیت تسلسل سے رواں رہتی ہے ایسے ہی یہ کہانی بھی اختتام پذیر نہیں بلکہ جاری و ساری رہنے والی ہے اور طرز حیات کی بے ترتیبی، جنسی گھٹن، نظام اخلاق میں بے قاعدگی اور سماجی رشتوں اور رابطوں کی بے ربطی ماضی کی طرح عہد نو کا بھی المیہ ہے۔

جہاں تک ناول کے اسلوب اور زبان و بیان کا تعلق ہے تو حسن منظر کے ہاں اُردو زبان میں ہندی اور انگریزی الفاظ کی چاشنی کے ساتھ ساتھ دلچسپ محاوروں کا چٹخارہ بھی موجود ہے۔ حسن منظر کے اسلوب اور زبان میں انگریزی اور اُردو کا امتزاج روایتی طریقے سے ہٹ کر ایک منفرد اور خوشگوار تبدیلی ہے، جس سے عام قاری بھی پڑھ کر لطف اندوز ہو سکتا

ہے کیونکہ انہوں نے مستعمل چھوٹے بڑے انگریزی الفاظ کا اُردو ترجمہ فٹ نوٹ میں درج کیا ہے۔ اگر بغور مشاہدہ کیا جائے ''تو یہ تبدیلی اکیسویں صدی میں ہمیں صرف حسن منظر کے ہاں ہی نظر آتی ہے۔''(۳) انسان، اے انسان میں ناول نگار نے نہ صرف مختلف زبانیں بخوبی استعمال کی ہیں بلکہ یہ اسلوب اپنے کرداروں اور ماحول سے مطابقت رکھے ہوئے ہے۔

یہ امر اس بات کا غماز ہے کہ ناول نگار کا تجربہ اور علم وسیع ہے۔ ناول میں مقامیت اور کردار بدلنے کے ساتھ ساتھ زبان میں بھی تغیر آتا رہتا ہے۔ بارہا مقامات پر ناول نگار نے فلسفیانہ فکر انگیز بیانات درج کیے ہیں مگر ان بیانات میں بوریت کا شائبہ تک نہیں ہے۔ ناول نگار نے فلسفی اور مفکر بننے کے بجائے نقاد بن کر زندگی کے مختلف پہلوؤں کو دیکھ کر پوری انسانی تاریخ کے تجربات کا ماحصل تلمیذ الرحمٰن کی زبان سے یوں پیش کروایا ہے:

> ''کاش دو زندگیاں دی ہوتیں ایک اپنی زندگی سے بسر کرنے، دوسری اس سے پیدا ہونے والے تجربے کے ساتھ بسر کر..... میں اس زندگی میں جان گیا ہوں وہ سب کیا ہے جس نے آخر میں مجھے تکلیف پہنچائی اور اگلی کے لیے سمجھ گیا ہوں کیسے بسر کرنی ہے۔''(۴)

دراصل 'کاش' کا لفظ ہر انسان کی زندگی میں اتنی ہی معنویت رکھتا ہے جتنی تلمیذ الرحمٰن کی زندگی میں اس کی اہمیت ہے۔ ہر انسان اپنی زندگی کے سابقہ تلخ تجربات کے بعد 'کاش' کا لفظ ہی کہتا ہے۔

کردار نگاری کے حوالے سے دیکھا جائے تو اس ناول میں پاکستان کے پست، متوسط اور مقتدر تینوں طبقات کو خوب صورتی سے پیش کیا گیا ہے۔ فتی، رشن اور کلو وغیرہ پست طبقے کے لوگ ہیں۔ فتی غریب ہے مگر وفادار ہے، رشن وہ سفید پوش پاکستانی معاشرے کا کردار ہے جو سارا دن مزدوری کر کے بمشکل گزارہ کرتا ہے اور کلو اُن لوگوں کا نمائندہ ہے جو زندگی گزارنے کے لیے غلط راہ کو اختیار کر کے سزا کے مستحق ٹھہرتے ہیں۔ تلمیذ الرحمٰن کا باپ اور اس کے بہنوئی وغیرہ متوسط طبقے کے نمائندے ہیں جن کے لیے سماجی روایات اور نام نہاد مذہبی اقدار بہت اہم ہیں اور جہاں حقوق العباد اور مذہبی عبادات پر کم زور ہے اور یہاں مذہب محض ڈھونگ اور دکھاوے کے لیے چند مذہبی تقریبات کی عقیدت کا نام ہے۔ خاندانی منصوبہ بندی کو ممنوعہ سمجھ کر تلمیذ الرحمٰن کا باپ دس بچے تو پیدا کرتا ہے مگر ان کی تربیت پر کوئی خاطر خواہ توجہ نہیں دیتا، اپنی جائیداد کے بٹوارے میں بیٹیوں کو حق وراثت سے محروم رکھتا ہے۔ بچوں کو تعلیم و تربیت کے واسطے اوروں کے در پر چھوڑنا پاکستانی معاشرے کا ایک بھیانک رُخ ہے۔ بلاشبہ والدین بچوں کے لیے اوّلین درس گاہ ہوتے ہیں اور جب والدین اپنے فرائض سے بجا آوری نہیں کرتے تو بچوں کی شخصیت و نفسیات تباہ و برباد ہو کر رہ جاتی ہیں اور ایسا ہی تلمیذ الرحمٰن کے ساتھ ہوا ہے۔ اگر اس کی صحیح تربیت ہوتی تو شاید وہ اپنے بیٹے کی تعلیم و تربیت صحیح کر پاتا اور اُس کا بیٹا لاوارث لاش کی صورت میں نہ ملتا، بلاشبہ تعلیم و تربیت سے نسلیں بگڑتی اور سنورتی ہیں۔ نجم کی موت تلمیذ الرحمٰن کا ہی نہیں بلکہ پورے پاکستانی معاشرے کا المیہ ہے۔ سردار اورنگ ناز سیاسی شخصیت ہے جو پاکستان میں مقتدر اور اعلیٰ درجے کا صحیح عکاس ہے۔ ان جیسے لوگوں کے ہاتھوں میں عوام کی تقدیر ہے، یہ کٹھ پتلیوں کی طرح معصوم عوام کا استعمال کرتے ہیں۔ قتل و غارت گری ان کے لیے معمولی بات ہے۔ سردار اورنگ ناز سرمایہ دارانہ نظام کا وہ نمائندہ ہے جو ظاہر کرتا ہے کہ ملکی دولت چند خاندانوں میں سمٹی ہوئی ہے

اور یہ وہ طبقہ ہے جو اسمبلیوں میں بیٹھ کر قانون سازی کرتے ہیں، سیاست ان کے گھر کی باندی اور قانون ان کا خریدا ہوا غلام ہے۔ سردار اورنگ ناز تلمیذ الرحمٰن کو قتل کے حکم کی تعمیل نہ کرنے کی وجہ سے جھوٹے مقدمے میں پھنسوا کر سزائے موت دلواتا ہے، ایسے ہی وڈیرے اور سیاست دانوں سے پاکستانی سیاست کی تاریخ بھری ہوئی ہے۔ یوں ناول میں تینوں طبقات کی بھرپور عکاسی موجود ہے۔ اچھائی اور برائی کا چولی دامن کا ساتھ ہے، ناول میں سکوارڈن لیڈر جبار محبِّ وطن فوجی ہے، کاسو اسمگلر ہو کر بھی انسانیت کے زندہ ہونے کی علامت ہے جو حق اور سچ بات کہنے کی پاداش میں موت کے منہ میں چلا جاتا ہے، ذاکر کانسٹیبل لاقانونیت اور بدامنی کے دور میں ایک امید کی مبہم کرن ہے جو ضمیر شناس ہے اور فتی انسان دوستی اور اعلیٰ انسانی اقدار کا جیتا جاگتا نمونہ ہے۔ اسی طرح منفی کرداروں میں مرتضیٰ قریشی ایک وکیل ہے جو جعل سازی اور فراڈ سے تلمیذ الرحمٰن کی مانند ہزاروں زندگیاں تباہ کرنے پر آمادہ رہتا ہے۔ یہ پاکستان کا وہ پڑھا لکھا طبقہ ہے جو مایوس اور گمراہ نوجوانوں کو غلط راہ پر ڈال کر پاکستان کے مستقبل کے ساتھ گھناؤنا اور خطرناک کھیل کھیل رہا ہے، ہمیں اپنے معاشرے میں اپنے اردگرد ایسے ہزاروں کردار باآسانی مل جائیں گے۔ غیور صحافی ہو کر صحافت کے نام پر دھبہ ہے جس کا کام خبروں سے لوگوں کو بلیک میل کرنا ہے اور شان الٰہی ایک کرپٹ کلرک ہے۔ یہ تینوں منفی کردار یہ باور کراتے ہیں کہ کرپشن پاکستان میں نیچے سے اوپر تک ہر طبقے میں سرایت کر چکی ہے اور اس میں کم پڑھے لکھے کلرک اور زیادہ پڑھے لکھے صحافی اور وکیل بھی ملوث ہیں۔ یہ تینوں منفی کردار جو بالترتیب وکیل، صحافی اور کلرک ہیں یہ معاشرتی اداروں کو گھن کی طرح چاٹ رہے ہیں۔

انسان، اے انسان کے تمام نسوانی کردار اعلیٰ اوصاف کے حامل ہیں۔ جدید دور میں ایسے بہت سے ناول نگار ہیں جنھوں نے عورت کو منفی روپ میں دکھایا ہے۔ درحقیقت ناول، داستان کے بعد وجود میں آیا ہے اور ہماری داستانوں میں عورت کا کردار زیادہ تر بے وفائی، مکاری اور جعل سازی کے زمرے میں آتا ہے مگر حسن منظر کے ہاں ایسا نہیں ہے۔ تلمیذ الرحمٰن کی ماں جو ایک بے نام کردار ہے مگر اولاد کے لیے ایک شفیق سایہ ہے، امینہ تلمیذ الرحمٰن کی رکھیل ہے مگر وفادار ہے۔ دل آرا فلم انڈسٹری میں کام کرتی ہے مگر اپنے خاوند کی مرضی سے اور میمونہ تلمیذ الرحمٰن کی وفا شعار بیوی ہے جو پاکستانی عورتوں کی نمائندہ ہے یہ وہ مشرقی عورت ہے جو مالی مصائب اور جسمانی تشدد کا شکار ہو کر بھی خاوند کو مجازی خدا سمجھ کر اس کے گھر سے چمٹی رہتی ہے لیکن وہ بیٹے کی موت کی اذیت نہیں سہہ پاتی، صبر کا پیمانہ لبریز ہونے پر اور اپنے باقی دو بچوں کی زندگیاں بچانے کی خاطر وہ خاوند سے خلع لے کر اُس کا گھر ہمیشہ کے لیے چھوڑنے پر آمادہ ہو جاتی ہے۔

ناول کا مرکزی کردار تلمیذ الرحمٰن ہے جو ابن آدم کا استعارہ ہے، اس کی سرشت میں گناہ شامل ہے اور ایک کمزور لمحہ اِس پر غالب آجاتا ہے اور اس کی زندگی کے رُخ کو بدل کر رکھ دیتا ہے۔ ناول کا یہ ہیرو حقیقی اور فطری لگتا ہے کیونکہ اسے آخر میں جب جیل سے بھاگ جانے کا موقع ملتا ہے تو وہ عام انسانی نفسیات کے مطابق فرار ہوتا ہے، اگر وہ ایسا نہ کرتا تو یہ کردار اور ناول دونوں غیر فطری اور غیر حقیقی لگتے۔ ناول کے ہیرو کے اس اختتامیہ فیصلے کے متعلق حسن منظر اس خیال کے داعی ہیں:

> ''تلمیذ الرحمٰن نے جب خود کو ایک نفس کی طرح موت کے لیے تیار کر لیا تھا ایک واقعے نے اس کی زندگی کو پھر بچا دی۔ وہ ٹولسٹوی کا نفس مطمئنہ نہیں تھا کہ فرار کا راستہ پا کر بھی یہی کہتا کہ خدا سچ کو

جانتا ہے اور میرا انتظار کر رہا ہے "God sees truths but waits" اور اڑ جائے کہ
مجھ پر غلط الزام ہے اس لیے خدا ہی اس قید سے نکالے گا، تو نکلوں گا۔ وہ ایک عام ہے، بھاگنے کا
فیصلہ اُس نے نہیں کیا۔ اُس لمحے نے کر دیا اور زندگی کا زیادہ تر یہی ڈھنگ ہے۔''(۵)

بلاشبہ ناول کا ہیرو ایک عام انسان ہے اور اس کی سوچ حقیقت کی عین عکاس ہے، اسے طویل زندگی گزارنے کے بعد جیل میں جا کر حقیقی زندگی کا تجربہ حاصل ہوتا ہے، وہ جان گیا تھا ضرورت کا دوسرا نام خواہش ہے اور یہ ضرورتیں مہد سے لے کر لحد تک انسان کا پیچھا نہیں چھوڑتیں، یہی ضرورتیں ضمیر اور دماغ میں جنگ و جدل کا باعث بنتی ہیں اور گھریلو زندگی سے لے کر کاروباری دُنیا تک پیچھا نہیں چھوڑتی ہیں۔ وہ یہ بھی جان گیا تھا کہ غربت اور مفلسی سے بڑا جرم دُنیا میں کوئی نہیں، خالی پیٹ اور بھوک سے غصہ جنم لیتا ہے اور جب پیٹ بھر جاتا ہے تب زندگی خوشگوار ہو جاتی ہے۔ درحقیقت یہی زندگی کے تلخ پہلو ہیں اور ان کی حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اس ناول کا لوکیل پاکستانی معاشرہ ہے اور تلمیذ پاکستانی معاشرے کا پروردہ وہ کردار ہے جسے نام نہاد مذہبی روایات اور سماجی گھٹن نے نفسیاتی طور پر تباہ اور خستہ حال کر دیا ہے۔ تلمیذ الرحمٰن کا کردار بیک وقت ہیرو اور اینٹی ہیرو کا ہے، وہ تن آسان ہے اور گناہ کی طرف رغبت رکھتا ہے۔ تلمیذ الرحمٰن کی طرح نگار خانہ دُنیا میں ازل سے ہزاروں گناہوں کی لذتیں انسان کے دامن کو اپنی طرف کھینچتی ہیں، وہ ان گناہوں کی طرف کشش محسوس کر کے ضمیر کے تصادم میں مفاہمت کی جستجو میں برسرِ پیکار رہتا ہے۔ اس سے انسانی ذات تضاد کا شکار ہو کر مایوسی اور کرب میں گھر جاتی ہے۔ تلمیذ الرحمٰن کے کردار میں ناول نگار نے اینٹی ہیرو کی شکل میں زندگی کی بدصورتیوں کو نمایاں اور انسانی نفس کو ظاہری اور باطنی دونوں سطحوں پر زوال کا شکار ہوتے دیکھ کر اس کی تخریب کاریوں کا ذکر کیا ہے۔ بالآخر تخریب کی یہ بے پناہ قوت تلمیذ الرحمٰن کی طرح ہر انسان کو ایسے بحران سے دوچار کرتی ہے کہ ساری اقدار سے ایمان اُٹھ جاتا ہے اور نتیجتاً انسان اپنی تہذیبی، ادبی، مذہبی، سماجی اور فکری روایات سے منہ موڑ لیتا ہے اور اس بغاوت کے بعد وہ مزید بوالعجبیوں کا شکار ہو جاتا ہے اور یہی ہر انسان اور تلمیذ الرحمٰن کے ساتھ ہوتا آیا ہے اور پھر بعد میں اسی کو مقدر کا نام دیا جاتا ہے۔ عام انسانی نفسیاتی تقاضوں کی طرح تلمیذ الرحمٰن میں بھی یہ خامی ہے کہ وہ اپنے ہر گناہ کا الزام کسی اور کے سر مونڈھ دیتا ہے۔ اپنے گھناؤنے افعال کے لیے کبھی وہ حالات اور کبھی ماحول کو موردِ الزام ٹھہراتا ہے۔ حد تو یہ ہے کہ وہ اپنے غصے کو بھی موروثی اور باپ دادا کی دین سمجھتا ہے، لہٰذا ان تمام برائیوں کی بنا پر یہ کردار اینٹی ہیرو بننے کے لائق بھی ہے۔

'انسان' ہی اس ناول کا اصل موضوع ہے۔ یوں تو ہر انسان سادہ اور معصوم فطرت پر پیدا ہوتا ہے بعد ازاں اس کے ذہن پر مذہب کی مہر ثبت کر دی جاتی ہے۔ ناول میں ایک غائبانہ کردار منظور کا ہے۔ منظور، تلمیذ الرحمٰن کا دور کا رشتہ دار ہے جسے ایک ہندو لڑکی سے عشق کرنے کی پاداش میں گھر والے پانی نہیں دیتے اور پیاس کے مارے اس کی موت مسجد کے احاطے میں ہو جاتی ہے۔ منظور کی موت کو سرکشی قرار دے کر امام مسجد اس کا جنازہ نہیں پڑھاتا اور سرکشی کے باعث منظور کا باپ اس کے جنازے میں شامل نہیں ہوتا۔ تلمیذ الرحمٰن کو بارہا اس کا بہنوئی منظور کہہ کر بلاتا ہے جس سے اس کے باطن میں مزید کشمکش پیدا ہو جاتی ہے۔ ناول میں منظور کی ضمنی کہانی سے حسن منظر محبت کا وہ درس دیتے ہیں جو کہ پریم چند اور منٹو کے ہاں ہے جہاں مذہب اور انسان کی تقسیم اور امتیاز نہیں ہے۔ انسان، اے انسان میں مذہبی رویوں کو اخلاقی اقدار کے

کینوس میں دیکھنے کا خوب صورت اور منفرد انداز موجود ہے۔ ناول نگار نے کمال فن کاری سے نام نہاد مذہبی ٹھیکے داروں کو دکھایا کہ وہ نہ صرف اپنے سخت گیر اصولوں کے بل بوتے انسانی اقدار اور محبت و آشتی کا گلا گھونٹ رہے ہیں بلکہ بچپن میں بچے کے اندر خوف، عذاب قبر اور موت کے منظر کے بیان سے خدا کے بارے میں ایسا تصور دیتے ہیں کہ بچہ اپنے اندر ایک گنہگار کو سانس لیتے ہوئے محسوس کرتا ہے۔ یوں وہ بچہ گناہ کے دو درجات بناتا ہے چھپ کر کیے جانے والا گناہ قابل معافی اور جو ظاہر ہو جائے وہ قابل سزا اور اسی طرح بچوں کی نفسیات دو خانوں اور دو درجات میں منقسم ہو کر منتشر ہو جاتی ہے۔ یہ مذہب کے ٹھیکے دار اپنی پسند اور اپنے بنائے ہوئے اصولوں کے تحت کسی کو کافر اور کسی کی موت کا فتویٰ دیتے ہیں لیکن وہ بھول گئے ہیں کہ تبدیلی کا عمل باطن سے پھوٹنا چاہیے نہ کہ ظاہری پرچار سے۔ مذہب کے نام پر انسانوں کا جبر و استحصال پاکستانی معاشرے میں ایک معمولی بات ہے یہ صورتِ حال جتنی خطرناک ماضی میں تھی اتنی ہی تباہ کن حال میں بھی ہے۔ عصرِ حاضر میں عالمی امن عامہ کی حالت کے پیش نظر مذہبی منافرت کے ان داخلی اور خارجی عناصر کا سدِ باب ضروری ہے۔

اس بات میں ہرگز دو رائے نہیں کہ یہ ناول ہماری زندگی کی صحیح اور سچی تاریخ ہے جس میں قدم قدم پر زندگی کی آغوش میں پنپنے والے افکار و خیالات، عقائد و نظریات اور ذہنی رجحانات کی تصویریں ملتی ہیں۔ یہ ناول تاریخ کا صحیح آئینہ ہے اور سماجی، معاشی، ذہنی و فکری زندگی کا سچا اور پرخلوص ترجمان ہے، جو براہِ راست اپنے زمانے کے حالات و واقعات اور فضا و ماحول سے پوری طرح اثرات قبول کیے ہوئے ہے۔ انسان، اے انسان ایک آئینہ خانہ ہے جہاں اظہارِ فکر میں مجموعی طور پر انسان کی زندگی کی بازگشت شامل ہے۔ بلاشبہ ناول نگار نے فلسفیانہ اور تخلیقی فکر سے انسانی ذات کے اس تجربے کو پھیلا کر زمانے کی دستاویز بنا دیا ہے اور زندگی کے بنیادی، آفاقی اور کائناتی موضوعات کو اپنے دامن میں جگہ دے کر ناول کو کثیر الجہات بنایا ہے اور یہ موضوعات اپنی ہمہ گیریت اور جامعیت کے باعث تاریخی اور جغرافیائی پابندیوں سے بھی آزاد ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ مہر ونہ لغاری، حسن منظر: ادبی خدمات، (لاہور: بی پی ایچ پرنٹرز، ۲۰۱۴ء)، ص ۲۵۳

۲۔ امتیاز پراچہ، *Dawn: Review Insaan Aye Insaan*، ۲۶ جنوری ۲۰۱۴ء

۳۔ روبینہ سلطان، تین نئے ناول نگار، (لاہور: دستاویز، ۲۰۱۲ء)، ص ۲۴۱

۴۔ حسن منظر، انسان، اے انسان، (کراچی: شہزاد، ۲۰۱۳ء)، ص ۵۴۶

۵۔ راقمہ کو حسن منظر کا لکھا گیا خط، مورخہ ۱۳ اگست ۲۰۱۵ء